درس ۲۶

اُمّتِ مُسلمہ سے خطاب کے ضمن میں

قرآنِ حکیم کی جامع ترین سورت

اُمُّ المُسَبِّحات : سورۃ الحدید

(۷)

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہِ الکریم ...... امّا بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرّجیم ۔ بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْہِ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَاَنْفَقُوْا لَھُمْ اَجْرٌ کَبِیْرٌ ۞ وَمَا لَکُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ ۚ وَالرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّکُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِیْثَاقَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۞ ھُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِہٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ وَاِنَّ اللّٰہَ بِکُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۞ وَمَا لَکُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلِلّٰہِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا یَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِکَ اَعْظَمُ دَرَجَۃً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۞ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ وَلَہٗۤ اَجْرٌ کَرِیْمٌ ۞﴾ (آیات ۷ تا ۱۱) ...... صدق اللّٰہ العظیم

یہ بات اس سے قبل کئی مرتبہ عرض کی جا چکی ہے کہ سورۃ الحدید کے پہلے حصے میں چھ آیات ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی بحث پر مشتمل ہے۔ اور یہ بحث قرآن مجید میں اس مقام پر جامعیت کبریٰ کی بھی حامل ہے اور اعلیٰ ترین علمی سطح پر جو مباحث اس سے متعلق ہیں ان سب کا احاطہ بھی کرتی ہے۔

© rasailojarai

دوسرا حصہ پانچ آیات (۷ تا ۱۱) پر مشتمل ہے‘ جس میں حد درجہ فصاحت و بلاغت اور ایک خطیبانہ انداز ہے۔ بندۂ مؤمن پر جو دین کے تقاضے ہیں یا بالفاظِ دیگر اللہ کا جو مطالبہ ہے اسے ایک آیت میں غایت درجہ جامعیت‘ ترتیب اور توازن کے ساتھ دو الفاظ کے حوالے سے مطالبات کو بیان کر دیا گیا۔ پھر دو دو آیات پر مشتمل دو حصے ہیں جن میں ان میں سے ایک ایک چیز پر ایک ایک آیت میں کچھ ملامت اور جھنجھوڑنے کا انداز ہے اور اس کے بعد ترغیب اور تشویق کا انداز ہے۔

آیت ۷ کے مباحث‘ ایک نظر میں

گزشتہ نشست میں ان پانچ آیات کا ترجمہ ہو چکا ہے اور پہلی آیت پر ہماری گفتگو بھی تقریباً مکمل ہو چکی ہے۔ پہلی آیت میں جو چند باتیں بیان ہو چکی ہیں انہیں صرف ذہن میں تازہ کر لیجئے۔

''اٰمِنُوْا'' کا حکم کسے دیا جا رہا ہے! ظاہراً اس میں غیر مسلم‘ کافر‘ یہودی‘ نصاریٰ سب شریک ہو سکتے ہیں‘ لیکن سیاق و سباق یہ معین کر رہا ہے کہ یہاں ان مسلمانوں سے خطاب کیا جا رہا ہے جن کی حرارتِ ایمانی میں کمی ہے‘ یعنی ضعیف الایمان مسلمان یا منافق۔ ان سے کہا جا رہا ہے: ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ ایمان پختہ رکھو اللہ پر اور اس کے رسول پر ﴿اَنْفِقُوْا﴾ اور خرچ کر دو اور کھپا دو —— آگے چل کر بات واضح ہو رہی ہے کہ ﴿وَاَنْفِقُوْا﴾ سے مراد ہے: اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اب دیکھئے کہ ''فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ'' سے مراد کیا ہے! یہ پہلی چھ آیات میں معین ہو چکا ہے کہ اس سے مراد ہے اللہ کی حکومت اس کی زمین پر قائم کرنے کے لئے جان و مال کا کھپانا۔ اس سورۂ مبارکہ کی دوسری اور پانچویں آیات کے الفاظ ہیں: ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اسی کے لئے ہے''‘ چنانچہ اس کی حکومت کے خلاف روئے ارضی پر جو بغاوت برپا ہے اسے فرو کرتے ہوئے اس کی حکومت کو بالفعل قائم کرنے کے لئے جان و مال کھپانے کی دعوت دی گئی ہے۔ آگے چل کر یہ بات مزید واضح ہو گئی کہ صرف مال کا کھپانا نہیں‘ جان کا کھپانا بھی

مطلوب ہے' اس لئے کہ الفاظ آئے ہیں: ﴿مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ﴾ کہ جس جس چیز میں بھی اس نے تمہیں خلافت عطا کی ہے۔ انسان کے پاس سب سے پہلا اثاثہ اس کا اپنا جسم ہے' اس کی توانائیاں ہیں' اس کی صلاحیتیں ہیں' اس کی استعدادات ہیں' اس کے اعضاء و جوارح ہیں۔ پھر اضافی طور پر جو کچھ اللہ تعالیٰ دیتا ہے' جس میں مال و منال ہے' اولاد ہے۔ ان چیزوں کو انسان یہ سمجھتا ہے کہ یہ میری ہیں' لیکن درحقیقت وہ اس کی ملکیت نہیں' نہ وہ ان کا مالک ہے' بلکہ اللہ نے ان میں اسے خلافت عطا کی ہے۔ تو جن جن چیزوں میں بھی تمہیں اللہ تعالیٰ نے خلافت عطا کی ہے' چاہے وہ تمہارے جسم و جان اور جسمانی صلاحیتیں ہیں' تمہاری مہلت عمر ہے یا تمہارا مال و منال ہے' تمہاری اولاد ہے' ان سب کو کھپاؤ اور لگاؤ اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اللہ کے دین کو برپا کرنے کے لئے' اس کی حکومت قائم کرنے کے لئے۔

میں یہ بھی واضح کر چکا ہوں کہ "مِمَّا" میں "مِنْ" اگرچہ تبعیضیہ ہے' لیکن یہ کس درجے میں مطلوب ہے! ایک کروڑ پتی چند ٹکے کسی کو دے کر یہ سمجھ لے کہ حاتم طائی کی قبر کو لات مار دی ہے تو یہ اس کا اپنا ایک زعم ہو سکتا ہے' جبکہ اللہ کو جو کچھ درکار ہے وہ تو یہ ہے کہ اپنے جسم و جان کے تعلق کو برقرار رکھنے اور دُنیوی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد جو بھی کچھ تمہارے پاس اس سے بڑھ کر ہے اور فاضل ہے' اسے اس کام میں کھپا دو! ﴿يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ﴾ "(اے نبی!) یہ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا کچھ خرچ کریں؟ کہہ دیجئے جو کچھ بھی تمہاری ضرورت سے زائد ہے"۔ تو گویا اصل شے جو ممنوع ہے وہ مال کا جمع کرنا ہے۔ جہاں تک خرچ کرنے کا معاملہ ہے اس میں کوئی حدود و قیود معین نہیں کی جا سکتیں۔ اس کا فیصلہ انسان کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس میں انسان کا جتنا جذبہ بڑھے گا اسی اعتبار سے وہ اپنے معیارِ زندگی کو کم کرتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ حضور ﷺ کے اتباع میں اختیاری فقر کی راہ پر گامزن ہو کر فقر کے اس درجہ کو پہنچ سکتا ہے جو فقراءِ صحابہؓ کا تھا۔ یہ معاملہ تمام صحابہ کا نہیں تھا۔ صحابہؓ میں ایک جماعت' جنہیں ہم فقراءِ صحابہؓ کہتے ہیں' فقرِ

© rasailojarai

اختیاری پر عامل تھی' یا پھر اسے اُمت میں صوفیاءِ کرام نے عملاً اختیار کیا۔ لیکن یہ واضح رہے کہ یہ اختیاری فقر ہے' اس میں جبر نہیں ہوتا' یہ انسان کے اپنے جذبۂ انفاق کی بنیاد پر اس کا اپنا فیصلہ ہوتا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ قانونی سطح پر 'اسلام' کا تقاضا یہ نہیں ہے۔ قانونی طور پر آپ زائد از ضرورت بھی رکھ سکتے ہیں' ایک حد سے زائد ہو جائے گا تو آپ سے جبراً زکوٰۃ لے لی جائے گی۔ ہنگامی حالات میں اگر کسی وقت محض زکوٰۃ سے معاشرے کے محتاج اور فقراء کی ضروریات کی کفالت نہ کی جا سکے تو مزید بھی جبراً لیا جا سکتا ہے' لیکن وہ محض ہنگامی صورت حال ہے' عام حالات میں نہیں۔ البتہ 'ایمان' کا تقاضا یہ ہے کہ زائد از ضرورت مال اپنے پاس رکھا نہ جائے' ﴿الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ﴾ والا معاملہ نہ ہو' ورنہ تو سخت وعید ہے ان الفاظِ قرآنی میں:

﴿وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ﴾ (التوبۃ:٣٤)

''اور جو لوگ سونے اور چاندی کو سینت سینت کر رکھتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے' انہیں بشارت دے دیجئے دردناک عذاب کی''۔

پھر میں نے وضاحت کی تھی کہ ﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْہِ﴾ کے الفاظ میں ہماری حیثیت حد درجہ dilute کی گئی ہے کہ ایک تو ہم ''مُستخلِف'' نہیں ''مُستخلَف'' ہیں۔ یہ اسم المفعول کا صیغہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ ہم نے خود یہ خلافت حاصل نہیں کی' یہ بھی ہمیں اللہ نے دی ہے۔ اوّل تو یہ کہ یہ ملکیت یا مالکیت نہیں ہے' خلافت ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ خلافت بھی ہم نے خود حاصل نہیں کی' یہ بھی عطا کردہ ہے۔ اور تیسرے یہ کہ ''جَعَلَکُمْ'' کی رو سے یہ بھی ''مجعولیت'' ہے۔ اس کے اندر مزید اضافہ کیا گیا ہے کہ اللہ نے تمہیں ''مُسْتَخْلَفِیْنَ'' (خلافت دیئے گئے) بنا دیا ہے۔ یہ ہے تمہاری اصل حیثیت۔ اپنی اصل حقیقت کو پہچانو!

آگے فرمایا: ﴿فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَاَنْفَقُوْا لَھُمْ اَجْرٌ کَبِیْرٌ﴾ اب جب یہ دو تقاضے ''ایمان اور انفاق'' سامنے آ گئے' تو جو بھی تم میں سے ان دونوں تقاضوں کو پورا کر دیں ان کے لئے بہت بڑا اجر ہے۔ نوٹ کیجئے کہ یہاں اجر کے ساتھ ''کبیر''

کی صفت آئی ہے۔ آگے چل کر گیارہویں آیت کے آخر میں، جس پر دوسرے حصے کی آیات ختم ہو رہی ہیں، ''اَجۡرٌ کَرِیۡمٌ'' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اجر کی دو صفات ہیں، دو dimensions ہیں۔ یعنی ایک تو مقدار کے اعتبار سے یہ اجر بہت زیادہ ہو گا، دوسرے یہ کہ جب یہ اجر دیا جائے گا تو اس میں عزت افزائی کا پہلو بھی ہوگا۔ ورنہ عام طور پر تو یہ ہوتا ہے کہ ''اَلۡیَدُ الۡعُلۡیَا خَیۡرٌ مِنَ الۡیَدِ السُّفۡلٰی'' کے مصداق لینے والا محسوس کرتا ہے کہ میری حیثیت کچھ کم ہوئی ہے، گری ہے، لیکن نہیں! اللہ کی طرف سے جب اجر ملے گا تو اس میں اکرام اور اعزاز ہوگا۔ وہ اجر کبیر بھی ہوگا اور اجر کریم بھی ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں جن چیزوں میں مُستخلَف بنایا ہے اگر یہ سب کچھ بھی ہم اللہ کی راہ میں خرچ کر دیں تب بھی اس زعم میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے کہ ہم نے کوئی بڑا تیر مارا ہے اور ہم کسی بہت بڑی بلندی تک پہنچ گئے ہیں، بلکہ اس پر بھی اللہ کا احسان ماننا چاہئے کہ اس نے ہمیں اس کی توفیق دی۔ اگر اس کی راہ میں سب کچھ بھی دے دیا تو یہ تمہارا اپنا تو تھا ہی نہیں، دیا ہوا اسی کا تھا۔ بقول غالب ؎

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

اگر تم نے اسی کی دی ہوئی شے اس کو لوٹا دی اور اسی کا دیا ہوا مال اس کے قدموں میں ڈال دیا تو کیا کمال کیا؟ اس حوالے سے شیخ سعدیؒ کے دو اشعار بہت ہی خوبصورت ہیں ؎

شکرِ خدائے کن کہ موفَّق شدی بخیر
ز انعام و فضل خود نہ معطل بداشتت

یعنی اللہ کا شکر ادا کرو کہ خیر کے لئے تمہیں اس کی جانب سے توفیق ملی ہے۔ اللہ نے تمہیں اپنے انعام اور فضل سے محروم نہیں کیا، معطل نہیں کیا۔

اس میں لفظ ''موفَّق''، توفیق سے اسم المفعول ہے، یعنی کہ تم موفَّق ہو، تمہیں توفیق بھی اسی کی دی ہوئی ہے۔

دوسرا شعر ہے: ؎

© rasailojaraid

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمیں کنی
منت شناس از و کہ بخدمت بداشتت

تم بادشاہ پر اپنا احسان نہ دھرو کہ تم اس کی خدمت کر رہے ہو' بلکہ بادشاہ کا احسان مانو کہ اس نے تمہیں اپنی خدمت کا موقع عطا کیا۔ ایسے ہی تم اللہ کے اوپر اپنا احسان نہ دھرو' بلکہ اس کا احسان مانو!

ایمان کی زوردار دعوت

آگے فرمایا: ﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ﴾ ''تمہیں کیا ہو گیا ہے' تم ایمان نہیں کیوں نہیں رکھ رہے اللہ پر؟'' اب نوٹ کیجیے کہ یہاں ایمان کون سا درکار ہے۔ یہ بات میں پرکار کی مثال سے آپ کو سمجھاتا ہوں کہ جیسے ایک پرکار کے دونوں بازو باہم جڑے ہوئے ہوتے ہیں اسی طرح آیت ۷ میں ایمان اور انفاق کے الفاظ جڑ کر ایک جگہ آئے ہیں۔ آگے دو دو آیتوں میں انہیں کھولا گیا ہے' جیسے پرکار کے بازو کھل جاتے ہیں' چنانچہ دو آیتیں ایمان اور دو آیتیں انفاق پر آئی ہیں۔ یہی پرکار سورۃ التغابن میں مزید کھلتی ہے جو سلسلۂ مُسبحات کی آخری سورت ہے۔ وہاں یہی مضمون دس آیات میں آیا ہے۔ آیت نمبر ۸ سے وہاں یہی دعوت ایمان شروع ہوئی ہے بایں الفاظ: ﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۝﴾ یہاں ایک آیت میں دعوتِ ایمان ہے جبکہ وہاں سورۃ التغابن میں یہ دعوت تین آیات میں ہے۔ اس کے بعد یہ سوال کہ کون سا ایمان درکار ہے' اس کی وضاحت وہاں پانچ آیتوں میں کی گئی ہے۔ پہلی بات یہ کہ اس میں تسلیم و رضا کی کیفیت ہو ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ یَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝﴾ (آیت ۱۱) یہاں ان آیات کا ترجمہ اور وضاحت کیے بغیر صرف حوالے دیئے جا رہے ہیں' اس لئے کہ ہمارے منتخب نصاب کے دروس میں سورۃ التغابن پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ تو پہلی بات یہ کہ تسلیم و رضا والا ایمان ہو۔ اس ایمان کا دوسرا پہلو ہے اطاعت۔ اس کے بارے میں فرمایا: ﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی

رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۝﴾ (آیت ۱۲) اگر اطاعت کاملہ نہیں تو ایمان کہاں ہے! اللہ کو مانتے ہو اور اطاعت نہیں کرتے؟ رسول کو مانتے ہو اور اس کا حکم نہیں مانتے' اس کا اتباع نہیں کرتے؟ چہ معنی دارد؟ تیسری بات یہ کہ توکل صرف اسی پر ہو ﴿اَللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ط وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ (آیت ۱۳) چوتھی بات یہ کہ دنیا میں جن سے بھی فطری' طبعی اور جبلی محبتیں ہیں' یوں محسوس کرو کہ ان محبتوں میں تمہارے لئے دشمنی مضمر ہے' یہ potential enemies ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْھُمْ ج﴾ (آیت ۱۴) یہی محبتیں ہیں جو اڑنگا لگاتی ہیں اور ان کی وجہ سے انسان اوندھے مُنہ گرتا ہے۔ یہی محبتیں ہیں جو اگر حد سے تجاوز کر جائیں تو انسان حرام میں مُنہ مارتا ہے' اللہ کے حقوق کو بھول جاتا ہے۔ ساری توانائیاں آل اور اولاد کے لئے کھپا دیتا ہے اور اللہ کے لئے تو اس کے پاس باقی کچھ رہتا ہی نہیں' کیا خرچ کرے گا' کیا کھپائے گا؟ اپنے وقت' اپنی صلاحیتوں اور اپنی قوتِ کار کی ساری پونجی تو صرف دنیا بنانے کے لئے اور اپنے اہل وعیال کے لئے بہتر سے بہتر سہولتیں حاصل کرنے کے لئے صرف ہو رہی ہے۔ اگلی آیت میں دوبارہ فرمایا: ﴿اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ ط﴾ (آیت ۱۵) ''تمہارے اموال واولاد تو (تمہارے حق میں) فتنہ ہیں''۔ پانچ آیتوں میں اس ایمان حقیقی کے ثمرات بیان کرنے کے بعد پھر ایک آیت میں ان کو دوبارہ سمویا گیا اور اس کے ساتھ ہی انفاق کا ذکر بھی آ گیا۔ یوں سمجھئے کہ وہ پرکار اب پوری طرح کھل رہی ہے۔ چنانچہ پرکار کا دوسرا سرا کیا ہے! فرمایا:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِکُمْ ط وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْہُ لَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ط وَاللّٰہُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ ۝﴾ (آیت ۱۶' ۱۷)

اسی طرح (سورۃ الحدید میں) ایمان اور انفاق پر مشتمل ساتویں آیت کی پرکار جو یہاں بندھی تھی' اگلی چار آیتوں میں ذرا کھل گئی ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَمَا لَکُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ

© rasailojaraid

بِـاللّٰہِ ﴾ تمہیں کیا ہو گیا ہے' تم کیوں نہیں ایمان رکھتے اللہ پر؟ وہ ایمان جو حقیقی ایمان ہے' اس پر تمہارا دل کیوں نہیں ٹھکتا؟ یہ زجر یا ملامت کا انداز ہے۔ آپ دیکھئے تین باتیں دہرائی گئیں: ﴿وَالرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّکُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِیْثَاقَکُمْ ﴾ اس سے بڑی بدنصیبی کیا ہو گی کہ بنفس نفیس اللہ کے رسولؐ تمہیں دعوت دے رہے ہیں اور تم اس سے اعراض کر رہے ہو؟ ایک طرف تو یہی سب سے بڑی خوش نصیبی ہے کہ اللہ کے رسول بذاتِ خود تمہیں دعوتِ ایمان دے رہے ہیں' لیکن اگر اس وقت بھی کوئی محروم رہ گیا تو بتایئے کہ اس سے بڑا بدنصیب کون ہو گا؟ ظاہر بات ہے کہ مدینہ کے اندر منافق بھی موجود تھے جو محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت سے بھی نہ متاثر ہوئے' نہ فیض یاب ہوئے۔ جو شے بجلی اور حرارت کے لئے غیر مُوصل (bad conductor) ہو' آپ کتنے ہی جتن کر لیں اس میں سے نہ حرارت گزرے گی نہ برقی رو گزرے گی۔ تو یہ بدنصیبی کی انتہا ہے۔ یہ وہی انداز ہے جو بعض احادیث میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ((...... وَاَنَا بَیْنَ اَظْھُرِکُمْ)) ''درانحالیکہ ابھی میں تمہارے مابین موجود ہوں (پھر بھی تمہارا یہ حال ہے!)'' دوسرے یہ کہ رسول ﷺ کس بات کی دعوت دے رہے ہیں! ﴿لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّکُمْ ﴾ تمہارے اپنے ربّ پر ایمان کی دعوت دی جا رہی ہے' کسی غیر پر ایمان کی دعوت تو نہیں دی گئی۔ تمہیں تمہارے اپنے پالن ہار' پروردگار' تمہارے خالق' تمہارے رازق پر ایمان کی دعوت دی جا رہی ہے۔ تیسری بات یہ فرمائی کہ ﴿وَقَدْ اَخَذَ مِیْثَاقَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۞ ﴾ ''اور وہ تم سے قول و قرار لے چکا ہے' اگر تم واقعتاً مؤمن ہو''۔

ان دونوں آیتوں کے بارے میں' جیسا کہ میں اس سے قبل بیان کر چکا ہوں' اگر ہم خطاب کے الفاظ پر نگاہ جمائیں گے تو اس خطاب میں مسلم و غیر مسلم دونوں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ اٰمِنُوْا ''ایمان لاؤ'' کے مخاطبین کمزور اہل ایمان بھی ہو سکتے ہیں اور کافر و مشرک بھی' جو ایمان سے بالکل محروم تھے۔ لیکن سیاق و سباق معین کر رہا ہے کہ یہاں گفتگو مسلمانوں سے ہے' غیر مسلموں سے نہیں ہے۔ اسی طرح اس آیت میں بھی لفظی طور پر ''میثاق'' کے

om

دو مفہوم مراد لئے جانے کا امکان موجود ہے۔ بالفرض اگر یہاں پر مخاطب کوئی غیر مسلم ہے' یا وہ شخص جو ابھی اپنے ایمان کا اعلان واعتراف نہیں کر رہا' تو یہاں ﴿وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ﴾ سے ''میثاق الست'' مراد ہوگا' یعنی اس دنیا میں آنے سے پہلے وہ تم سے میثاق لے چکا' بایں الفاظ: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى﴾۔ اب یہاں ﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ میں ایمان کا لفظ اپنے اصطلاحی مفہوم میں نہیں لیا جائے گا' بلکہ ایمان کا لفظی معنی یعنی تصدیق مراد لیا جائے گا کہ اگر تم تسلیم کرو! اپنی فطرت کی گہرائیوں میں جھانکو تو تمہیں آثار نظر آجائیں گے۔ ایک مرتبہ اے کے بروہی صاحب نے ملاقات میں مجھے کسی فلسفی کا ایک قول سنایا تھا۔ وہ فلسفی گویا خالق کی طرف سے یہ تعبیر کر رہا ہے:

"You would not have searched for me unless you had possessed me in the very beginning".

یعنی اگر بالکل آغاز ہی میں تمہارا میرے ساتھ ایک تعلق قائم نہ ہوا ہوتا تو تم مجھے ہرگز تلاش نہ کرتے۔

انسان میں فطری طور پر اللہ تعالیٰ کی ایک طلب ہے' اس کی تلاش ہے۔ جیسے ایک دعا ہے ۔

مجھ کو ہے تیری جستجو' مجھ کو تری تلاش ہے
خالق مرے کہاں ہے تو مجھ کو تری تلاش ہے!

ہمارے ہائی سکول کے زمانے میں روزانہ صبح یہ دعا پڑھی جاتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ انسانی اس کا ثبوت دیتی ہے۔ کیسے کیسے لوگ جنگلوں اور صحراؤں کے اندر خاک چھانتے پھرتے رہے اور پہاڑوں میں جا کر تپسیائیں کرتے رہے۔ کس لئے؟ معلوم ہوا کہ فطرت انسانی میں کوئی طلب ہے' کوئی خواہش ہے' کوئی urge ہے۔ آپ کو بھوک لگتی ہے تو آپ کھانے کی تلاش میں سرگرداں ہوتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو بھی کوئی طلب تھی جو انہیں کشاں کشاں لئے پھرتی رہی اور یہ طلب درحقیقت اس بات کا مکمل ثبوت ہے جو متذکرہ بالا قول میں بیان ہوئی ہے۔ عہدِ اَلست کو قرآن مجید تو ایک عظیم الشان واقعہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا

© rasailojaraid

بَلٰی ﴾لیکن جو بھی شخص اپنی فطرت کی گہرائیوں کے اندر جھانکے گا اسے اس عہدِ اَلست کے آثار نظر آئیں گے' چاہے وہ یاد نہ آئے۔ اگرچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنے ربّ سے وہ عہد کیا تھا۔ اب ظاہر بات ہے کہ ارواح میں فرق و تفاوت تو ہے۔ وہ روح جو اللہ نے انہیں عطا کی تھی اس کے اندر وہ یادداشت برقرار رہی ہوگی۔ لیکن بہرحال اس وعدے کی یاد اگرچہ برقرار نہ رہی ہو' لیکن اس کے آثار اور اس کے اثرات فطرت انسانی میں موجود ہیں۔ ﴿وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ ﴾ کے الفاظ میں اگر لفظی طور پر یہ امکان ہے تو اس کی وضاحت بھی میں نے کر دی' لیکن یہاں حقیقتاً وہ مراد نہیں ہے۔ یہاں اصل میں خطاب ان مسلمانوں سے ہے جو ضعیف الایمان ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے عرض کیا تھا کہ آج کے مسلمانوں کے لئے یہ سورتیں قرآن مجید کا سب سے زیادہ قیمتی حصہ ہیں۔ اس لئے کہ نزولِ قرآن کے وقت کا تو ضعیف ایمان بھی ہمارے آج کے ایمان کے مقابلے میں بہت بلند و بالا' بہت پختہ اور مستحکم تھا۔ آج ہمارا جو حال ہے اس کے پیش نظر ہمیں تو بہت زیادہ ضرورت ہے کہ ان آیات کو حرزِ جان بنالیں۔

﴿وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۞﴾ ''وہ تم سے قول و قرار لے چکا اگر تم مؤمن ہو!'' یہاں پر اصطلاحی ترجمہ کیجئے کہ اگر تم مؤمن ہو' تم ایمان کے دعویدار ہو پھر تو تمہارا عہد و میثاق اور قول و قرار ہو چکا۔ یہاں سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۱۱ ذہن میں لائیے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ﴾ ''اللہ تو خرید چکا ہے اہل ایمان سے ان کی جانیں اور مال جنت کے عوض''۔ اب یہ جان و مال ان کے ہیں کہاں؟ اب تو گویا ان کے پاس محض ایک امانت کے طور پر رکھے ہوئے ہیں کہ جیسے ہی مطالبہ ہو حاضر کر دیئے جائیں۔ یہ ہے درحقیقت وہ قول و قرار' کہ اگر تم مؤمن ہو پھر تو تم اپنی جان اور مال فروخت کر چکے' اب وہ تمہاری ملکیت ہے ہی نہیں۔ اوّلاً تو اصولی طور پر تم اس کے مالک نہیں' پھر یہ کہ اس قول و قرار سے اس کی مزید توثیق ہوگئی۔ اب یہ تمہارے پاس امانت ہے۔ بڑا پیارا شعر ہے ع

om

وبالِ دوش ہے سر جسمِ ناتواں پہ مگر
لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لئے

گویا Life is a liability۔ واقعہ یہ ہے کہ بسا اوقات انسان محسوس کرتا ہے کہ یہ زندگی ایک بوجھ ہے' لیکن بندۂ مؤمن یہ سمجھتا ہے کہ مجھے صرف اللہ اور اس کے دین کے لئے یہ بوجھ اٹھائے رکھنا ہے۔ اس زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے بھی جو حق اسے میں دے رہا ہوں وہ صرف حضور ﷺ کی اس ہدایت کی بنا پر ہے کہ: ((وَاِنَّ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْجِکَ عَلَیْکَ حَقًّا)) ''یقیناً تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے''۔ مؤمن کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی زندگی کا جو اصل مقصد ہے اور جو اُس کی اصل منشا ہے جس کے لئے وہ اسے preserve کر رہا ہے' وہ وقت آئے کہ وہ یہ دے کر فارغ ہو جائے' جیسا کہ سورۃ الاحزاب میں ارشاد ہوا: ﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ﴾ ''ان میں وہ بھی ہیں جو اپنی نذر پیش کر چکے (شہید ہو چکے) اور باقی جو ہیں وہ منتظر ہیں (کہ کب موقع آئے اور ہم اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں دے کر سبکدوش ہو جائیں)''۔

ایمانِ حقیقی کا منبع وسرچشمہ -- قرآنِ حکیم

اب اس کے بعد اگر دلوں کو ٹٹولیں اور محسوس ہو کہ واقعتاً وہ حقیقی ایمان تو موجود نہیں ہے' تو سوال ہے کہ کہاں جائیں؟ ؏ ''کس طرف جاؤں' کدھر دیکھوں' کسے آواز دوں؟'' وہ کون سا بازار ہے جہاں سے ایمان کی جنس گراں مایہ ملتی ہے؟ اس کی طرف بھی اشارہ کر دیا: ﴿هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ﴾ ''وہی تو ہے (اللہ) جو نازل فرما رہا ہے اپنے بندے پر روشن آیات تا کہ تمہیں نکال لائے اندھیروں سے روشنی کی طرف''۔ یہاں دیکھئے' بجائے ''رسول'' کے ''عبد'' کا لفظ آیا ہے۔ یہ میں نے بارہا عرض کیا ہے' اس وقت صرف اشارہ کر رہا ہوں کہ جہاں بھی اللہ کا اپنے رسول کے لئے شفقت اور عنایت خصوصی کا انداز ہوتا ہے وہاں نسبت رسالت کی بجائے نسبتِ عبدیت کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ جیسے

© rasailojaraid.com

سورۂ بنی اسرائیل کے آغاز میں فرمایا: ﴿سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا﴾ اور سورۃ الکہف کا آغاز ہوا ان الفاظ مبارکہ سے: ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَلَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا ؕ﴾ وہی انداز یہ ہے: ﴿ھُوَ الَّذِیۡ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبۡدِہٖۤ﴾ لیکن یہ سمجھئے کہ ''عبد'' (بندہ) اور چیز ہے اور ''عبدہٗ'' (اُس کا بندہ) اور چیز ہے۔ بقول اقبال۔

عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر
ما سراپا انتظار او منتظر!

کہنے کو تو ہم بھی کہتے ہیں کہ ہم اس کے بندے ہیں، نام بھی عبد اللہ رکھ لیتے ہیں، لیکن عبدیت کا حق ادا کرنا آسان کام نہیں ہے۔ تو فرمایا: ﴿ھُوَ الَّذِیۡ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبۡدِہٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ﴾ وہی ہے جو نازل فرما رہا ہے اپنے بندے (ﷺ) پر وہ آیات جو بیّن ہیں، روشن ہیں۔ بیّن اس شے کو کہتے ہیں جو از خود واضح اور از خود روشن ہو، اسے کسی اور وضاحت کی ضرورت نہ ہو، اسے کسی دلیل خارجی کی حاجت نہ ہو۔ جیسے ہم کہتے ہیں ع ''آفتاب آمد دلیلِ آفتاب!'' یعنی سورج طلوع ہو گیا تو اب سورج کے وجود کے ثبوت کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو خود اپنے وجود پر سب سے بڑی برہان اور دلیل قاطع ہے۔ قرآن مجید اپنی آیات کے لئے اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ (روشن اور بیّن آیات) کی ترکیب استعمال کرتا ہے۔ سورۃ التغابن میں تو قرآن حکیم کے لئے لفظ ہی ''نور'' آیا ہے: ﴿فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ وَالنُّوۡرِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلۡنَا﴾ ''پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل فرمایا''۔ یہ از خود نور ہے اور در حقیقت اسی سے نورِ ایمان پیدا ہوتا ہے۔ یہ نورِ وحی، نورِ فطرت کے ساتھ مل کر نورِ ایمان پیدا کرتا ہے۔ ہمارے اس منتخب نصاب کے حصہ دوم میں سورۃ النور کی آیات کے ضمن میں یہ بحث تفصیل سے آئی ہے کہ ﴿نُوۡرٌ عَلٰی نُوۡرٍ﴾ میں ایک نورِ فطرت ہے اور ایک نورِ وحی، ان دونوں کے امتزاج سے نورِ ایمان وجود میں آتا ہے۔

یہ بات پہلے بیان ہو چکی ہے کہ قرآن مجید میں نور کا لفظ ہمیشہ واحد آتا ہے، جبکہ

com

"ظلمات" ہمیشہ جمع کی صورت میں آتا ہے۔ چنانچہ سورۃ النور میں بھی الفاظ آئے ہیں:
﴿ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ "اندھیرے ہیں تہہ بر تہہ"۔ اس لئے کہ نور ایک بسیط حقیقت ہے اور تاریکی (darkness) کے بے شمار shades ہیں' مثلاً کفر' شرک' الحاد' انسانی حاکمیت کا تصور' مادہ پرستی' شہوت پرستی' دولت پرستی' شہرت پرستی' قوم پرستی' خود پرستی' نفس پرستی اور اس طرح کی بے شمار پرستشیں۔ یہ سب ظلمات ہی کے مختلف سائے ہیں' یہ تمام اندھیرے ہیں اور ان تمام اندھیروں سے نکال کر نور ایمان میں لانے والی شے قرآن حکیم کی آیات بیّنات ہیں۔

یہاں آیات کے باہمی ربط' ان کی ترتیب اور سیاق و سباق کے حوالے سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ جو ایمان حقیقی مطلوب ہے اس کا واحد منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ ایمان کے دعوے داروں سے کہا جا رہا ہے کہ تمہارے دلوں میں حقیقی ایمان کیوں موجود نہیں ہے جب کہ یہ ایمان کا منبع و سرچشمہ موجود ہے؟ عین کنویں کے کنارے پر کھڑے ہوئے پیاسے کیوں ہو؟ اور اس کنویں کی نشان دہی ان الفاظ میں کر دی گئی: ﴿هُوَ الَّذِىْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ اس سے واضح ہو رہا ہے کہ ایمان حقیقی کا منبع اور سرچشمہ قرآن مجید ہے۔

۱۹۹۱ء میں "حقیقت ایمان" کے موضوع پر محاضرات میں مَیں نے نظری اعتبار سے یہ بات مانی تھی اور آج بھی مانتا ہوں کہ ایک وہ ایمان ہے جس کے لئے آج کی اصطلاح blind faith ہے۔ یہ ایمان بھی اگر یقین کے درجے کو پہنچ جائے گا تو اس شخصِ متعلق کے لئے مفید ہوگا' مؤثر ہوگا۔ یہ blind faith انسان کو محض صحبت صالحہ سے بھی حاصل ہو جاتا ہے' جیسے آگ کے سامنے بیٹھیں گے تو آپ کو حرارت مل جائے گی' صاحب یقین کی صحبت ہوگی تو آپ کو یقین حاصل ہو جائے گا۔ اس میں آپ کے فہم اور شعور کا کوئی حصہ نہیں' یہ تو درحقیقت ایک طبعی عمل (physical phenomenon) ہے۔ اسی طرح ایک ایمان عمل سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ آپ دین کے جملہ احکام پر عمل شروع کر دیجئے۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص نسلی مسلمان ہے' ابھی ایمانِ حقیقی اسے حاصل نہیں ہے'

© rasailojaraid

لیکن جو بھی فرائض دینی ہیں ان کو بجا لا رہا ہے تو اس سے بھی یقیناً ایک reflection ہو گی' اور قلب میں یقین کی سی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ تو عمل سے اور صحبتِ صاحبِ ایمان سے بھی ایمان پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہاں ایمان کا ذکر جس سیاق وسباق میں ہو رہا ہے وہ درحقیقت حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے شرطِ اوّل ہے' یعنی انقلاب برپا کرنا اور اَفراد کو نہیں بلکہ نظام کو بدلنا ہے۔

اس کے لئے ایک اصول ذہن نشین کر لیجئے کہ انسانی زندگی کے اجتماعی نظام میں معاشرہ ایک شخص واحد کی طرح behave کرتا ہے۔ ایک فرد کے اعضاء وجوارح کو کنٹرول کرنے والی شے اس کا دماغ ہے۔ ہاتھ کسی شے کو پکڑ سکتا ہے' اس میں یہ طاقت ہے' لیکن کس شے کو پکڑے اور کس کو نہ پکڑے' اس کا فیصلہ ہاتھ خود نہیں کر سکتا' بلکہ ذہن کرتا ہے۔ اسی طرح پاؤں میں آپ کو لے کر چلنے کی صلاحیت ہے' مگر وہ کدھر کو جائے' کدھر کو نہ جائے' اس کا فیصلہ پاؤں خود نہیں کر سکتا' بلکہ ذہن کرتا ہے۔ اسی طرح ہر انسانی معاشرے میں ایک brain trust ہوتا ہے ۔ یہ وہاں کی ذہین اقلیت (intelligentsia یا intellectual elite) ہے جو brain trust کی حیثیت رکھتی ہے اور اس معاشرے کا رُخ معین کرتی ہے۔ اگر یہ ''ذہین اقلیت'' دولتِ ایمان سے محروم رہتی ہے اور آپ نے کچھ افراد کو اِدھر اُدھر ایمان کی دولت دے بھی دی' کچھ اصلاح ہو بھی گئی تو بھی معاشرہ بحیثیت مجموعی اس رُخ پر تبدیلی اختیار نہیں کرے گا جو آپ چاہتے ہیں۔ چنانچہ معاشرے کی بحیثیت مجموعی اصلاح کے لئے وہ ایمان درکار ہے جو علٰی وجہ البصیرت ہو۔ جیسے کہ سورۂ یوسف میں حضور ﷺ کو حکم دیا گیا: ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰهِ عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ﴾ ''کہہ دو (اے نبی ﷺ!) یہ ہے میرا راستہ' میں اللہ کی طرف بلا رہا ہوں' میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی''۔ میں اپنے راستے کی طرف علٰی وجہ البصیرت بلا رہا ہوں۔ میں اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں نہیں مار رہا ہوں' اور نہ صرف میں بلکہ وہ بھی جو میری پیروی کر رہے ہیں علٰی وجہ البصیرت میرا ساتھ دے رہے ہیں۔ تو دراصل ایسے لوگ

com

ہوتے ہیں کہ جو انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ معاشرے کے brain trust کو transform کریں گے' اور جب اس کی قلب ماہیت ہو گی تو معاشرہ مجموعی طور پر تبدیلی قبول کرے گا' ورنہ نہیں کرے گا۔ اور اس شعوری ایمان کا منبع اور سرچشمہ صرف قرآن ہے۔ اس لئے کہ قرآن مجید ایک انسان کو ایک کل کی حیثیت سے' مجموعی حیثیت سے اپیل کرتا ہے۔ یہ انسان کے احساسات و جذبات کو بھی اپیل کرتا ہے اور اس کے تعقل و تفکر کو بھی۔ قرآن مجید بار بار تعقل و تفکر کی دعوت دیتا ہے: ﴿اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۞﴾ ''کیا تم غور نہیں کرتے؟ (تمہیں کیا ہو گیا ہے)'' ﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۞﴾ ''کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟'' قرآن مجید میں بڑے سے بڑے فلسفی کے لئے بھی ہدایت موجود ہے اور ایک عام انسان کے لئے' بھی اس میں ہدایت ہے۔ اس حوالے سے درحقیقت انقلاب کے لئے' حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے لئے' معاشرے کو بدلنے کے لئے جو ایمان درکار ہے اُس کا واحد منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔

اس سلسلۂ کلام میں بھی اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے بایں الفاظ: ﴿هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۞﴾ ''وہی ہے (اللہ تعالیٰ) جو اپنے بندے (محمد ﷺ) پر واضح آیات نازل فرماتا ہے' تاکہ تمہیں اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لائے۔ اور یقیناً اللہ تمہارے حق میں رؤف بھی ہے' رحیم بھی ہے''۔ یہ دونوں صفات رء و ف اور رحیم اس سورۂ مبارکہ کی آیت ۲۷ میں ''رَاْفَۃ'' اور ''رَحمۃ'' کے الفاظ میں آئی ہیں۔ ﴿وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ؕ﴾ ''اور جن لوگوں نے ان (عیسیٰ علیہ السلام) کی اتباع کی ان کے دلوں میں ہم نے نرم دلی اور رحم ڈال دیا''۔ یہاں پر ذرا اچھی طرح جان لیجئے کہ لفظ ''رَءُ و ف'' قرآن مجید میں گیارہ مرتبہ آیا ہے اور ان میں سے نو مرتبہ لفظ ''رَحِیْمٌ'' ہی کے ساتھ جڑ کر آیا ہے۔ قرآن مجید میں کسی اور صفت کے ساتھ اس لفظ (رَءُ وْ فٌ) کی combination نہیں ہے' البتہ بعض مقامات پر تنہا آیا ہے' جیسے ﴿رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ﴾۔ یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ یہ دس مرتبہ تو

© rasailojaraid

اللہ تعالیٰ کے لئے آیا ہے اور ایک مرتبہ سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۲۸ میں محمد رسول اللہ ﷺ کے لئے آیا ہے بایں الفاظ: ﴿بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ ''مؤمنوں پر نہایت مہربان اور رحم والا ہے''۔

''رأفت'' اور ''رحمت'' میں جو ایک نسبت اور رشتہ ہے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ ہم اللہ تعالیٰ کے لئے یہ لفظ استعمال کرتے ہوئے جھجک محسوس کریں گے کہ اللہ تمہارا ہمدرد ہے' یہ لفظ اللہ کے شایانِ شان نہیں ہے' لیکن رأفت کی اصل حقیقت ہمدردی ہی ہے۔ مشہور شعر ہے۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے!

ایک سلیم الفطرت انسان کے دل میں کسی کو تکلیف اور مصیبت میں دیکھ کر جو احساس ہوتا ہے اور وہ اس کے درد کو اپنے اندر محسوس کرتا ہے' اسی کو ہم رأفت یا ہمدردی کہتے ہیں۔ درحقیقت جس شخص کے اندر رأفت کا وصف ہوگا وہی اس مصیبت زدہ شخص کے لئے بھلائی کی کوشش کرے گا' اس کے لئے کوئی relief فراہم کرنے اور اسے کسی طریقے سے مصیبت سے نجات دلانے کی کوشش کرے گا۔ پہلے ایک احساس ہوگا تب اس کا نتیجہ برآمد ہوگا۔ تو ''رأفت'' اصل میں وہ عکس ہے کہ جو کسی کے دکھ اور درد کو دیکھ کر باطن میں پڑتا ہے اور اس کا نتیجہ ''رحمت'' ہے۔ اس احساس کے نتیجے میں اب اس کے درد کو رفع کرنے کے لئے' اس کے مسئلہ اور مشکل کو حل کرنے کے لئے جو کوشش ہوگی وہ درحقیقت رحمت کا مظہر ہے۔ گویا ''رأفت'' اور ''رحمت'' کا تعلق باہم sensory اور motor کا سا ہے' جو کہ فزیالوجی کی اصطلاح ہے۔ کسی بھی معاملے میں پہلے sensation ہوتی ہے۔ اگر کسی چیونٹی نے آپ کے ہاتھ پر کاٹا ہے تو پہلے sensation کے ذریعے دماغ کو اس کی اطلاع ملی اور وہاں سے motor کے ذریعے حکم آیا تو آپ نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا کہ یہاں تو کوئی چیز ہے جو تجھے تکلیف پہنچا رہی ہے۔ یہی معاملہ رأفت اور رحمت یا رؤف اور رحیم کے مابین ہے۔ چنانچہ قرآن

حکیم میں ہمیشہ لفظ رءوف لفظ رحیم سے پہلے آیا ہے۔ جیسے ہم نے ''العزیز'' اور ''الحکیم'' کی نسبت کو سمجھا تھا کہ ایک طرف اس کے پاس اختیارِ مطلق (authority) ہے' اس پر کوئی checks and balances نہیں ہیں' دوسری طرف اس کی حکمت کامل ہے' اور اس کا اختیارِ مطلق اس کی حکمتِ کاملہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے' اسی طرح اللہ تعالیٰ رؤف بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔ اپنی زبان میں ہم الفاظ استعمال کر سکتے ہیں کہ نہایت شفیق اور مہربان ہے۔

اب یہاں جو بات قابلِ غور ہے وہ یہ کہ اللہ کی رحمت کا مظہرِ اعظم اور مظہرِ اتم یہ قرآن ہے۔ سورۃ الرحمٰن کی پہلی چار آیات میں دراصل اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿اَلرَّحْمٰنُ ۞ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۞﴾ ''نہایت رحم والا ہے جس نے قرآن سکھایا''۔ اب دیکھئے ان میں کیا نسبت ہے! یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی شانِ رحمانیت کا مظہر ہے کہ اس نے قرآن سکھایا۔ ''رَحْمٰن'' ''فَعْلَان'' کے وزن پر اسم مبالغہ ہے کہ جس میں کوئی بھی کیفیت پورے جوش و خروش کے ساتھ ہوتی ہے' ایک طوفانی کیفیت ہوتی ہے۔ تو درحقیقت اللہ تعالیٰ کی رحمت کی طوفانی اور ہیجانی کیفیت کا مظہرِ اتم یہ قرآن ہے۔ اس لئے کہ یہ ہدایت ہے اور رحمت ہے۔ اسی سے تمہاری عاقبت یعنی آخرت کی زندگی سنورے گی جو کہ اصل اور ابدی زندگی ہے۔ یہی نور ہے' یہی راستہ دکھانے والا ہے۔ جیسے کہ حضور کریم ﷺ سے ایک بہت ہی پیاری اور جامع دعا مروی ہے جس میں ہم کہتے ہیں...... وَاجْعَلْهُ لَنَا اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّهُدًى وَّرَحْمَةً کہ اے ہمارے پروردگار! اس قرآن مجید کو ہمارا امام بنا دے' اسے ہمارے لئے نور' ہدایت اور رحمت بنا دے۔

انفاق فی سبیل اللہ کی زوردار دعوت

آگے فرمایا: ﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں'' ﴿وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''حالانکہ (تم خوب جانتے ہو کہ) آسمانوں اور زمین کی کُل میراث بالآخر اللہ کے لئے رہ

© rasailojaraid

جائے گی''۔ اگرچہ اس آیت پر اصل گفتگو تو اگلی نشست میں ہوگی' لیکن نوٹ کر لیجئے کہ ایک تو ہم پہلے سمجھ چکے ہیں کہ سورۃ الحدید کی آیت ۷ میں جو انفاق کا لفظ آیا ہے اس سے مراد ''انفاق فی سبیل اللہ'' ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اس سے مراد ''انفاقِ مال'' بھی ہے اور ''بذلِ نفس'' بھی ہے۔ اب یہاں لفظ ''قتال'' کے حوالے سے اس کی تشریح آرہی ہے۔ ایک حدیث نبویؐ کے حوالے سے لفظ ''میراث'' کو سمجھئے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں: ''ابن آدم کہتا ہے کہ میرا مال' میرا مال! لیکن اے ابن آدم! تمہارے مال میں سے تمہارا اس کے سوا اور کیا ہے کہ جو تم نے کھالیا اور ختم کر دیا' یا پہنا اور پرانا کر دیا' یا پھر جو تم نے (اپنی زندگی میں) صدقہ کر دیا اور آگے بھیج دیا''۔ (مسلم' ترمذی' نسائی) مسلم کی ایک دوسری روایت میں الفاظ آئے ہیں کہ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ اسے لوگوں کے لئے چھوڑ کر جانے والا ہے۔ یعنی باقی جو مال ہے وہ تمہارا نہیں' تمہارے وارثوں کا ہے۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہؓ سے سوال کیا: ((اَیُّکُمْ مَالُ وَارِثِہٖ اَحَبُّ اِلَیْہِ مِنْ مَالِہٖ؟)) ''آپ لوگوں میں سے کون ہوگا جسے اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ عزیز ہو؟'' صحابہ کرامؓ نے بالکل سادگی کے ساتھ حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم میں سے کوئی ایسا نہیں جسے خود اپنا مال (وارث کے مال سے) محبوب تر نہ ہو۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: ((فَاِنَّ مَالَہٗ مَا قَدَّمَ وَمَالَ وَارِثِہٖ مَا اَخَّرَ)) ''اس کا مال تو وہ ہے جو اُس نے آگے بھیج دیا اور اس کے وارث کا مال وہ ہے جو اُس نے پیچھے چھوڑا''۔ (صحیح بخاری) ـــــ یعنی تمہارا مال تو وہی ہے جو تم اللہ کی راہ میں اپنی زندگی کے اندر خرچ کرتے ہو' باقی تمہارے وارث کا مال ہے جو تم جمع کر رہے ہو۔ دیکھئے خرچ کرنا ایک ضرورت ہے' اپنے آپ کو maintain کرنا ہے' اپنے جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنا ہے۔ سر چھپانے کے لئے کوئی ایک چھت بھی چاہئے' آپ کو کھانا بھی چاہئے۔ اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنا اپنی جگہ صحیح ہے۔ اور اگر آپ نے ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ کے مصداق اپنے

.com

آپ کو اللہ کے لئے وقف کر دیا ہو تو درحقیقت یہ سب کچھ بھی فی سبیل اللہ شمار ہو گا۔ گویا جو کچھ آپ اپنی ضروریات پر صرف کر رہے ہیں وہ بھی اللہ کے لئے کر رہے ہیں۔ صرف یہ بات پیش نظر رہے کہ ضرورت سے زائد کو جمع نہ کریں۔ جمع صرف آسمان پر کریں، جیسے حضرت مسیح علیہ السلام کے ایک وعظ کا مفہوم ہے کہ زمین پر جمع نہ کرو جہاں چوری کا بھی ڈر ہے، ڈاکے کا بھی اندیشہ ہے، کیڑا بھی خراب کرتا ہے، دیمک بھی لگ جاتی ہے، بلکہ آسمان پر جمع کرو، جہاں نہ چوری کا ڈر، نہ ڈاکے کا خوف، نہ کیڑا خراب کر سکے۔ اس لئے کہ میں تم سے صحیح کہتا ہوں کہ جہاں تمہارا مال ہو گا وہیں تمہارا دل بھی ہو گا—— مال یہاں جمع کیا ہوا ہو گا تو ظاہر ہے دل بھی یہیں پر لگا ہو گا۔ دنیا سے جانے کو دل نہیں چاہے گا اور فرشتے دھکے دے دے کر لے کر جائیں گے۔ آدمی آگے جانے کے لئے تیار نہیں ہو گا۔ بلکہ حدیث میں الفاظ آتے ہیں کہ جیسے کانٹے دار سیخ کے اوپر سے کباب اتارا جاتا ہے اسی طریقے سے ایسے لوگوں کی روحیں کھینچی جائیں گی۔ ان کے برعکس ایک وہ ہیں جو جانے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ بقول اقبال ؎

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست!

اس لئے کہ وہ اپنا سب کچھ تو پہلے ہی آگے بھیج چکے ہیں۔ ان کے لئے تو موت گویا ایک خوشخبری ہے۔ انہوں نے تو زندگی بھر کی کمائی وہاں آسمانوں پر جمع کی ہوئی ہے۔ ان کے لئے تو موت ایسے ہو گی جیسے کہ ایک بند مشکیزے میں سے ایک بوند پانی کی ٹپک جائے۔ ان کے لئے یہاں سے نقل مکانی کرنے میں کوئی ناگواری نہیں ہو گی، کوئی سختی نہیں ہو گی۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو ایسی موت عطا فرمائے! آمین!

بارک اللہ لی ولکم فی القرآن العظیم ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیم

© rasailojarai